## درس ۲۶

# اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
# قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
# اُمُّ المُسَبِّحات : سورة الحدید
## (۳)

نحمدهٗ ونصلی علی رسوله الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾

### تکملۂ مباحث

گزشتہ نشست میں اگرچہ ہماری گفتگو تیسری آیت تک پہنچ گئی تھی لیکن پہلی دونوں آیتوں کے بارے میں بھی بعض اہم باتیں رہ گئی تھیں۔ آج ہمیں پہلے ان کا قرض ادا کرنا ہے' پھر آگے بڑھنا ہے۔

پہلی آیت مبارکہ جو اِس سورۃ کا ''مطلع'' ہے' اس میں یہ بحث تو مکمل ہو گئی کہ سَبَّحَ یُسَبِّحُ اور سَبَحَ یَسْبَحُ کا لغوی مفہوم کیا ہے اور اللہ کی تسبیح سے کیا مراد ہے۔ پھر یہ کہ یہ تسبیح قولی بھی ہے اور حالی بھی' اور قرآن حکیم میں یہ فعل مضارع میں بھی آئی ہے اور فعل ماضی میں بھی۔ گویا اس کائنات کی ہر شے ہر آن اللہ کی تسبیح کر رہی ہے' ہمیشہ سے کرتی چلی آ رہی ہے اور ہمیشہ کرتی رہے گی۔ یہ مضمون تو سامنے آ گیا' لیکن غور کرنا ہوگا کہ اس مضمون کی اہمیت کیا ہے۔ اس قدر اہتمام اور شد و مد کے ساتھ پانچ سورتوں کے آغاز میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے' اس کا کیا سبب ہے؟

© rasailojaraid

جان لیجئے کہ اصل میں یہ الفاظ حصولِ معرفت رب کے ذریعے اور طریقے پر بحث کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' انسان کے لئے اللہ کی معرفت ہی اصل مطلوب ومقصود ہے' جب صحیح معرفت حاصل ہو جائے گی تو اس کا ظہور اعمال سے خود بخود ہونا شروع ہو جائے گا اور انسان حق عبادت بھی ادا کر سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ معرفت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

اللہ کی معرفت کے حصول کے دو راستے ہیں:

(۱) عقلی اور منطقی راستہ (Rational Approach)

(۲) قلب اور روح کے ذریعے اللہ کو پہچاننا (Mystic Approach)

اگر چہ ہمارے صوفیاء کا اصل میدان تو مؤخر الذکر ذریعہ ہی ہے' لیکن قرآن مجید نے اسے زیادہ نمایاں نہیں کیا' اگر چہ اس کو تسلیم کیا ہے اور اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا ایک عام اسلوب ہے کہ بعض چیزوں پر زیادہ زور دیتا ہے اور انہیں زیادہ نمایاں کرتا ہے اور بعض سے وہ سرسری طور پر گزرتا ہے۔ اس میں بھی یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے اور کوئی سبق مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝﴾ (الذّٰریٰت: ۲۱) ''اور تمہارے وجود میں بھی (ہماری نشانیاں ہیں)' کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟'' کبھی اپنے باطن میں جھانکو تو سہی! اقبال نے اس کی تعبیر اس طرح کی ہے ؏ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!

حقیقت کا ادراک اور معرفتِ ربّ انسان اپنے باطن سے کر سکتا ہے۔ اسی کے لئے meditation اور مراقبے ہیں۔ صوفیاء نے جو راستے اختیار کئے ان کو قرآن نے اصولاً مانا ہے۔ ایک حدیث' جو اگر چہ محدثین کے نزدیک مستند نہیں ہے' مگر صوفیاء اسے تسلیم کرتے ہیں' اس میں یہ مضمون اس طرح آیا ہے: ((مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ)) ''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا''۔ اور قرآن مجید میں یہ مفہوم موجود ہے۔ اسی سلسلہ سور میں یعنی سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں ہے کہ:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (آیت ۱۹)
''اور تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا اور پھر اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

گویا اللہ کی معرفت کا نتیجہ معرفت نفس ہے۔ اپنے آپ کو بھی انسان تبھی پہچانے گا اگر اللہ کو پہچانے گا۔ اسی کا عکس (Converse) یہ ہے کہ اگر آپ اپنے آپ کو پہچانیں گے تو اللہ کو پہچانیں گے۔ گویا یہ بات دونوں طرف سے صحیح ہے۔ اس لئے کہ روحِ انسانی کا ذاتِ باری تعالیٰ سے ایک خاص ربط و تعلق ہے جس کے لئے قریب ترین تمثیل یا تشبیہہ یہ ہے کہ سورج اور اس کی شعاعیں کروڑوں میل کا سفر کر کے زمین تک پہنچ رہی ہیں' بلکہ آگے بھی نا معلوم کہاں تک جاتی ہیں' لیکن ہر شعاع کا تعلق سورج کے ساتھ برقرار ہے۔ تو ارواحِ انسانیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک ربط و تعلق رکھے ہوئے ہیں۔ گویا اللہ کو پہچاننے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی روح کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں غور و فکر کرے۔ تاہم جیسا کہ میں نے عرض کیا' قرآن مجید میں معرفت ربّ کے عقلی و منطقی ذریعے کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ لیکن پھر استدلال اور منطق کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱) استخراجی منطق (Deductive Logic): اس میں آدمی ایک ایک قدم آگے بڑھا کر دلیل کے حوالے سے فہم و شعور حاصل کرتا ہے۔

۲) استقرائی منطق (Inductive Logic): اس میں انسان کائنات میں موجود تنوع کے بارے میں اپنے مشاہدات جمع کرتا ہے اور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ قرآن مجید نے induction ہی کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ہر شے کو اللہ کی آیت قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (آل عمران: ۱۹۰)
''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ہوش مند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔''

© rasailojaraid

یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں پوری تفصیل کے ساتھ آیا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۝﴾ (البقرۃ:۱۶۴)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے مُردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' ان لوگوں کے لئے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یہ استقراء ہے۔ اقبال نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے ۔

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

ہمارے متکلمین اور فلاسفہ کا طریقہ استخراجی منطق (Deductive Logic) کا تھا اور اب اس کا دور گزر چکا۔ چونکہ سائنس کی بنیاد بھی استقراء (induction) ہے لہٰذا اسی کے حوالے سے اقبال نے اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ ''عہد حاضر کے سائنٹیفک کلچر کا Inner Core قرآنی ہے''۔ اس لئے کہ قرآن مشاہدے کی دعوت دیتا ہے:

﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ كَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ كَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ كَیْفَ سُطِحَتْ ۝﴾ (الغاشیۃ:۱۷۔۲۰)

''بھلا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

یہ تمام اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان مشاہدات کے ذریعے معرفتِ ربّ حاصل کرو۔ قرآن مجید میں اصل زور آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی کے مشاہدے پر ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط﴾

(حٰم السجدۃ:۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی‘ یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔''

اس لئے کہ حضور ﷺ کے زمانے کے بعد Scientific Era شروع ہونے والا تھا۔ (سائنس کی موجودہ ترقی کوئی بہت قدیم نہیں ہے‘ بلکہ دو تین سو برس کے اندر ہی یہ بہت بڑا دھماکہ ہوا ہے) ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید اس سائنسی دَور کا فاتح ہے کہ اس نے انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ط إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ (بنی اسراءیل:۳۶)

''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ‘ کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔''

یعنی تم اپنے موقف کی بنیاد توہمات پر نہ رکھو‘ بلکہ عقل سے استدلال کرو‘ سمع و بصر سے کام لو اور نتیجہ اخذ کرو۔ قرآن مجید میں اس پر جو زور دیا گیا ہے‘ وہ دو وجوہ سے ہے:

۱) عرب جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے‘ ان کا ذوق منطقی اور فلسفیانہ نہیں تھا۔ وہ ایک اُمّی قوم تھی‘ جس میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ وہ قوتِ کار اور قوتِ کردار کے مالک تھے۔ خاص طور پر مکہ کے لوگوں کا معاملہ یہ تھا کہ جب تک کوئی دشمن تھا تو جانی دشمن تھا‘ لیکن جب کوئی ہاتھ میں ہاتھ دے دیتا تھا تو وہی ''وَلِیٌّ حَمِیْمٌ'' بن جاتا تھا۔ ان کے یہاں کسی قسم کی منافقت نہیں تھی‘ بلکہ کردار کی بڑی پختگی تھی کہ جو کہہ رہے ہیں وہی کر رہے

© rasailojaraid

ہیں۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ اور منطق ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس حوالے سے بھی قرآن مجید نے Inductive Logic کو نمایاں کیا' اور اس اعتبار سے بھی کہ اب Scientific Era کا آغاز ہونا تھا۔

بہرحال قرآن کا ایک اسلوب وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ ہر شے اللہ کی نشانی ہے' اسے دیکھو اور اس کے ذریعے اللہ کو پہچانو ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرے ہوشیار
ہر ورق دفتر است از معرفت کردگار

گویا درخت کا ہر پتا اللہ کی معرفت کا دفتر ہے۔ اسی مضمون کو قرآن نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ہر شے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے وجود سے اپنے خالق اور صانع اور موجد کے ایک ہستی کامل ہونے کا اعتراف اور اقرار و اعلان کر رہا ہے اور اسی کے ذریعے سے تم اللہ کی معرفت حاصل کر سکو گے۔ یہ ہے اس مضمون کی اہمیت جو اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں بیان ہوا:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝﴾

دوسری آیت کے مرکزی مضمون (اللہ تعالیٰ کے اختیار و اقتدار) پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ بات دوبارہ نوٹ کر لیجیے کہ یہ بہت اہم مضمون ہے۔ چنانچہ ان چھ آیات میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔ پہلی آیت کا اختتام ہوا: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''وہ غالب' حکمت والا ہے''۔ پھر یہ الفاظ ان آیات میں دو مرتبہ آئے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے''۔ اس کے علاوہ آج ہم پڑھیں گے کہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ ''پھر وہ عرش پر متمکن ہوا''۔ یعنی اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد وہ کہیں الگ تھلگ ہو کر نہیں بیٹھ گیا کہ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو' جیسا کہ بعض فلاسفہ کا خیال ہے' بلکہ وہی ہے جو تخت حکومت پر متمکن ہے۔ ان چھ آیات کے اندر چار مرتبہ emphasise کیا گیا کہ اس کائنات کا شہنشاہ مطلق اللہ ہے اور پوری کائنات میں اسی کی حکومت بالفعل قائم

om

ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کے ایک گوشے میں موجود انسانی زندگی کی اس کائنات کے ساتھ کیا نسبت تناسب بنے گی؟ اور اس میں بھی انسان کی زندگی کا تھوڑا سا حصہ ہے جس میں اسے آزادی (Free Will) دی گئی ہے۔ اور اس ہلدی کی گانٹھ کو لے کر آدمی حاکم (sovereign) بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر بغاوت کرتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ......﴾ (الروم:٤١)

''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔''

اور در حقیقت اس سورۂ مبارکہ میں جو زور دے کر کہا جا رہا ہے کہ لگا دو، خرچ کر دو اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں، تو کس کام کے لئے؟ تاکہ اللہ کی حکومت قائم کی جائے! جسے بائبل کی Lord,s Prayer میں اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ:

*Thy Kingdom come,*
*Thy will be done on earth*
*as it is in Heavens.*

یعنی اے ربّ! تیری مرضی جس طرح آسمانوں میں نافذ ہے اسی طرح زمین پر بھی تیری حکومت قائم ہو جائے! یہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے، اسی کا نام اقامتِ دین ہے، اسی کا نام غلبہ دینِ حق ہے، اسی کا نام تکبیرِ ربّ ہے۔ ان سورتوں میں سارا زور اسی پر ہے کہ ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ اللہ کے دین کو پورے کے پورے نظامِ زندگی پر غالب کر دے۔ یہی مقصد بعثتِ محمدیؐ ہے۔ یہی وہ مقصد ہے (نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنا) جس کے لئے تمام رسول بھیجے گئے۔ اب ظاہر ہے اس کے لئے جان کھپانی ہو گی، مال خرچ کرنا ہو گا، وقت پڑنے پر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنا ہو گا اور گردنیں کٹوانی ہوں گی۔

## تیسری آیت: مشکل ترین مقام

اب آئیے تیسری آیت کی طرف۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ فلسفۂ وجود سے بحث کرتی ہے جو کہ فلسفے کا مشکل ترین موضوع ہے۔ اس ضمن میں دو باتیں بنیادی طور پر سمجھ لیجئے۔

© rasailojaraid

ایک یہ کہ قرآن دقیق فلسفیانہ مسائل ضمنی طور پر زیر بحث لاتا ہے اور ان پر زیادہ بحث نہیں کرتا، لیکن لاتا ضرور ہے۔ اس کے بھی دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہی بات جو پہلے کہی جا چکی ہے کہ قرآن کے اولین مخاطب اُمّی تھے، لیکن رسول اکرم ﷺ کی بعثت تو پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (سبا: ۲۸) ''اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپ کو تمام ہی انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے''۔ اور نہ صرف آپؐ اپنے دور کے تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے بلکہ تا قیامِ قیامت آپؐ ہی کا دورِ رسالت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ بنی نوع انسان میں ہر طرح کے آدمی ہیں۔ عوام بھی ہیں، خواص بھی ہیں، جاہل بھی ہیں، علماء بھی ہیں، فضلاء بھی ہیں، فلاسفہ بھی ہیں، ہر ذہنی سطح کے لوگ ملیں گے، ہر طرح کی تہذیب اور تمدن سے واسطہ پڑے گا۔ ان سب کی طرف رسالت محمدیؐ کی بعثت ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے تحت جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ ہے کہ پہلے ایک قوم کا انتخاب کیا اور اس کے ذہن، فکر، عمل اور اخلاق و کردار کے اندر ایک عظیم انقلاب برپا کیا اور اسے instrument بنایا کہ اب بقیہ نوع انسانی تک یہ پیغامِ رسالت تم پہنچاؤ۔ اس میں ظاہر ہے کہ پہلی مخاطب قوم کی ذہنی سطح کو اگر ملحوظ نہ رکھا جاتا تو یہ پیغام خود اس قوم کی ذہنی سطح سے بالاتر رہتا۔ اس حوالے سے قرآن مجید کا بڑا حصہ اُس قوم کے عقل و شعور کی سطح کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ البتہ چونکہ قرآن حکیم ہمیشہ کے لئے ہدایت ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پوری نوع انسانی کے لئے ہے جس میں علماء و حکماء بھی ہوں گے لہٰذا قرآن حکیم دقیق فلسفیانہ مسائل کو بھی touch کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بڑے بڑے فلسفیوں کو بھی تو آخر ہدایت یہیں سے نصیب ہونی تھی، بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر کی فکری پیاس بھی آخر اسی چشمۂ حیواں سے بجھنی تھی، جس نے کہا کہ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی\
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں!

مشرق ومغرب کے سارے فلسفے کھنگالنے کے بعد علامہ اقبال کو اگر آسودگی میسر آئی اور اگر سکون نصیب ہوا تو قرآن مجید کے دامن میں۔ چنانچہ اپنے فلسفہ خودی کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ فلسفہ قرآن سے اخذ کیا ہے۔ سید نذیر نیازی نے علامہ اقبال سے دریافت کیا تھا کہ آپ کے اس فلسفہ خودی کا ماخذ کیا ہے اور اس اعتبار سے آپ کس مغربی فلسفی کے خوشہ چین ہیں؟ تو علامہ نے ان سے فرمایا کہ کل فلاں وقت آجانا' میں تمہیں لکھوا دوں گا۔ سید نذیر نیازی یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں میں بہت خوش تھا کہ مجھے یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ شاعر مشرق مجھے اپنے فلسفہ خودی کا source لکھوائیں گے۔ لیکن جب سید نذیر نیازی علامہ اقبال کی خدمت میں پہنچے تو اقبال نے کہا کہ قرآن مجید نکال لو اور سورۃ الحشر کی آیت ١٩ کھول کر کہنے لگے کہ میرے فلسفہ خودی کا ماخذ یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾

''اور ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

تو قرآن مجید میں یہ چیزیں بھی موجود ہیں' لیکن ضمنی طور پر آئی ہیں' اس طور سے کہ اس زمانے کا عرب اسے پڑھتے ہوئے ذرا سا تو ٹھٹکے' لیکن اس سے کوئی مفہوم اخذ کر کے آگے نکل جائے' رک نہ جائے بلکہ گزر جائے۔ البتہ کوئی ایسا شخص جس کے ذہن میں فلسفیانہ مسائل ہوں گے وہ جب آئے گا تو رک جائے گا کہ جا ایں جا ست! یہ ہے اصل جگہ۔ وہ اس مقام پر غور کرے گا اور اس کی ہدایت اسے وہاں سے مل جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ جو خود فلسفی و حکیم ہے اسے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی' اس کے لئے تو اشارہ کافی ہے' اس کو راہنمائی کے لئے چند الفاظ مل گئے تو اس کی الجھن حل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل قرآن مجید میں موجود تو ہیں' لیکن اس طرح کہ جن لوگوں کا مزاج فلسفیانہ نہیں وہ وہاں سے گزر جائیں گے' لیکن جن کے ذہن میں سوالات ہیں وہ وہاں رک جائیں گے۔ اب امام رازی' جو بہت بڑے منطقی' فلسفی اور متکلم ہیں وہ اس

© rasailojaraid

مقام پر رک گئے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہتے ہوئے تھر تھر کانپ رہے ہوں:

اعلم ان ھذا المقام مقام غامضٌ عمیقٌ مھیبٌ

''جان لو کہ یہ مقام بڑا عمیق اور گہرا مقام ہے' بڑا پُر ہیبت مقام ہے!''

اور آج کے دور میں مثلاً مولانا اصلاحی صاحب یہاں سے ایسے گزر گئے جیسے یہاں کچھ ہے ہی نہیں۔ اپنی تفسیر کے اندر وہ حدیث کا سہارا بہت کم لیتے ہیں۔ ان کا اپنا ذوق اور مزاج تفسیر القرآن بالقرآن کا ہے۔ چنانچہ بعض معاملات میں تو انہوں نے متفق علیہ احادیث کو بھی لائق اعتناء نہیں سمجھا اور اٹھا کر پھینک دیا۔۔۔۔ لیکن یہاں صرف ایک حدیث کا سہارا لے کر گزر گئے جیسے اس آیہ مبارکہ میں اور کچھ ہے ہی نہیں۔ بہر حال یہ اصولی بات ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید میں دقیق فلسفیانہ مسائل پر مفصل بحث نہیں ہوتی بلکہ صرف اشارہ ہوتا ہے۔

## فلسفہ وجود اور اس کی مختلف تعبیرات

یہ بات خاص طور پر یہ نوٹ کیجئے کہ فلسفہ وجود فلسفے کا دقیق ترین مسئلہ ہے' اور اس کے بارے میں مجھے قطعاً یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں فلسفے کا طالب علم ہوں' نہ یہ میرا مقام ہے کہ میں اس پر authoritative انداز میں کوئی گفتگو کر سکوں' لیکن اس کے باوجود مَیں اس پر کیوں گفتگو کرتا ہوں' اسے سمجھ لیجئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر و اسلاف میں سے بہت سے حضرات وحدت الوجود کے قائل ہیں اور عام اہل مذہب کی جو ذہنی سطح ہے وہ وحدت الوجود کو کفر سمجھتے ہیں۔ اس طرح ایک بہت بڑا dilemma پیدا ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ابن عربی کو تو خیر چھوڑ دیجئے کہ ان کی حیثیت کسی مفسر' محدث یا فقیہہ کی نہیں ہے' اگرچہ مجددّ الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ جو ان کے سب سے بڑے ناقد ہیں اور ان کے فلسفے کے جواب میں انہوں نے وحدت الشہود کے نام سے فلسفہ پیش کیا ہے' وہ ابن عربی کے مقام کے زبردست قائل ہیں۔ وہ اپنے مکتوبات کے اندر یہ بھی کہتے ہیں کہ میں انہیں (اپنے کشف کے ذریعے) خاصانِ خداوند کے اندر دیکھتا ہوں۔ اور ایک جگہ یہ الفاظ آئے

ہیں کہ ’’ما زلہ برداریِ خوانِ ایشانم ...... کہ میں تو ان کے دستر خوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والوں میں سے ہوں‘ لیکن چونکہ معاملہ صفاتِ باری تعالیٰ کا ہے اور مجھے ان سے اختلاف ہے لہٰذا میں اپنا اختلاف پیش کرنے پر مجبور ہوں‘‘۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ کسی کو ابن عربی سے سوءِ ظن ہو‘ کوئی انہیں مرتد سمجھے یا جو چاہے کہے اس سے کوئی بہت بڑا فرق واقع نہیں ہوتا‘ لیکن شاہ ولی اللہؒ کو اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ مشرک تھے یا مرتد تھے یا ضال اور مضل تھے تو یہ بات بڑی تشویش کی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری اور بہت بڑی بڑی شخصیات وحدت الوجود کی قائل ہیں۔ اس حوالے سے میں اپنے درس میں کوشش کیا کرتا ہوں کہ کم سے کم اس درجے تک بات واضح ہو جائے کہ ان حضرات سے سوئے ظن نہ رہے۔ کوئی فلسفہ ہے اس سے آپ اختلاف کریں‘ آپ کو بڑے سے بڑے انسان سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے‘ لیکن یہ سمجھنا کہ وہ گمراہی اور کفر کے اندر مبتلا ہو گئے (معاذ اللہ) بہت بڑی غلطی ہے۔ اس طرح تو پھر ہمارے لئے اپنے اسلاف میں کوئی سہارا نہیں رہے گا۔ اس حوالے سے میں اس موضوع پر گفتگو کیا کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ موضوع بہت مشکل ہے اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ خود مجھ پر ایک دہشت کی کیفیت ہے کہ میں اسے بیان کرسکوں گا یا نہیں!

میں اس مسئلہ کو پہلے کچھ مقدمات کے حوالے سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ جہاں تک خالق کی ایک ہستی کا تعلق ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے‘ یہ فطرتِ انسانی کے اندر نقش ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ (ابراھیم: ۱۰) ’’کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہوسکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟‘‘ معلوم ہوا کہ خدا کو ماننا کہ کوئی خالق ہستی موجود ہے‘ یہ گویا فطرت انسانی کے اندر پہلے سے نقش ہے‘ اسے ہر انسان مانتا ہے چاہے اسے کوئی نام دے دے۔

*Call the rose by any name, it will smell as sweet.*

اس ضمن میں عوامی سطح پر لوگوں کی گمراہی یہ رہی ہے کہ جب وہ خالق کی ہستی کا قیاس

© rasailojaraid.c

کرتے ہیں تو اپنے بڑے سے بڑے انسان کے تصور سے اوپر نہیں جا سکتے۔ مثلاً کوئی بہت بڑا شہنشاہ ہے تو اس کے بھی کچھ نائبین سلطنت ہوتے ہیں' اس نے انہیں کچھ نہ کچھ اختیارات دیئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بڑی سے بڑی شخصیت کے کچھ لاڈلے اور پیارے ہوتے ہیں جن کی بات وہ ردّ نہیں کر سکتا۔ یہ تصورات انسان نے اپنے ذہن کے حوالے سے اُس خالق کے ساتھ بھی چسپاں کر دیئے ہیں کہ اللہ تو وہ ہے' لیکن آلِهَة بھی ہیں' چھوٹے چھوٹے معبود بھی ہیں۔ ''مہادیو'' تو ایک ہی ہے لیکن دیوتا اور دیویاں بھی ہیں جنہیں اس نے اختیارات دے رکھے ہیں' اس لئے کچھ بندگی اور ڈنڈوت ان کی بھی کرو تاکہ وہ بھی راضی ہو جائیں۔ دیوی دیوتاؤں کا تصور اصل میں ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ ملائکہ نورانی مخلوق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ ﴿يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ ''وہ وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے''۔ قرآن مجید میں حضرت جبرائیلؑ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿لَهٗ مَابَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ﴾ (مریم : ٦٤)

''جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے (یعنی ہمارا اپنا وجود) ہر چیز کا مالک وہی ہے''۔

تو یہ اپنے وجود کے بھی مالک نہیں ہیں' یہ بھی اللہ کے اختیارِ مطلق میں ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ تصور جس نے ہمیں شرک سے بچا لیا' ورنہ اتنی برگزیدہ ہستیوں کو صاحب اختیار سمجھا جا سکتا تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت جبرائیلؑ کی شان میں تو یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۞ ذُوْمِرَّةٍ ۭ﴾ (النجم: ٥'٦)

''ان (محمد ﷺ) کو زبردست قوت والے (جبرئیلؑ) نے تعلیم دی ہے' جو بڑا صاحب حکمت ہے''۔

دوسری جگہ یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۞ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۞ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۞﴾ (التکویر : ۱۹ ـ ۲۰)

om

''یہ فی الواقع ایک بزرگ پیغام بر (جبرئیلؑ) کا قول ہے جو بڑی طاقت کا مالک ہے' عرش والے کے ہاں بلند مرتبہ ہے' وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے' وہ بااعتماد ہے''۔

اگر ہمارے پاس ان کے اختیار کے بارے میں واضح تعلیمات نہ ہوتیں تو ہم بھی انہیں دیوتا مان سکتے تھے' اور فرشتوں کے بارے میں یہی کچھ ان تمام مذاہب میں ہوا ہے۔ لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس آفاقی کائنات کے کارندے ہیں لیکن ان کا اختیار کوئی نہیں ہے' یہ وہی کچھ کرتے ہیں جن کا حکم اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن مشرکین نے یہ تصور قائم کیا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور عیسائیوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ حضرت مسیحؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔ اس قسم کے تصورات سے شفاعت باطلہ کا تصور پیدا ہوا۔ چنانچہ اس عوامی سطح پر توحید اور معرفت ربّ کے ضمن میں کرنے کا کام یہ ہے کہ واضح کر دیا جائے کہ حاکم مطلق اللہ ہے اور اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے' اُس کی اجازت کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا' وہی تنہا معبودِ حقیقی ہے۔

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق!

اس سے ذرا بلند تر سطح پر آیئے تو وہی اللہ تمہارا مطلوب و مقصود ہونا چاہئے۔ ساری محبتیں اس کی محبت کے تابع ہونی چاہئیں۔ مطلوب اور مقصود کے درجے میں اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ گویا لا الٰہ الاّ اللہ ہی کی تعبیر ہے: **لا معبودَ اِلاَّ اللّٰہ' لا مقصودَ اِلاَّ اللّٰہ' لا مطلوبَ اِلاَّ اللّٰہ'** اور **لا محبوب اِلاَّ اللّٰہ** ۔ یہ ہے عوامی سطح پر توحید کا تصور۔ جو انسان یہاں تک پہنچ گیا اس کی توحید کامل ہو گئی۔

ایک اس سے بلند تر سطح ہے جس پر آ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق کو تو ہم نے مان لیا لیکن اس خالق اور مخلوق (کائنات) میں نسبت کیا ہے؟ یعنی اسے دو حصّوں میں تقسیم کر لیجئے۔

۱) خالق نے اس مخلوق کو کیسے پیدا کیا؟

۲) اب خالق و مخلوق کے درمیان کیا ربط ہے؟ جسے فلسفیانہ اصطلاح میں ''ربط الحادث

© rasailojaraid

بالقدیم'' کہا جاتا ہے۔اس قدیم (اللہ) اور حادث (کائنات) میں ربط کیا ہے؟

یہ ہے فلسفۂ وجود کا وہ مسئلہ جس کے اعتبار سے مختلف مکاتیب فکر پیدا ہوئے۔ اس ضمن میں ہمارے ہاں دو بڑے نظریئے ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' مشہور ہیں۔لیکن اس سے پہلے جو بڑی گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں اور انسان نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں ان کو سمجھ لیجئے۔ایک تصور ہندو فلاسفی میں یہ دیا گیا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ایسا ہی ربط ہے جیسے ایک بڑھئی میز بنا دیتا ہے' لیکن بڑھئی کو میز بنانے کے لئے پہلے لکڑی درکار ہے۔یعنی پہلے مادۂ تخلیق موجود ہوگا تب ہی خالق اس سے کوئی چیز بنائے گا۔اب خالق تو ہے پرماتما' جس نے یہ کائنات تخلیق کی' لیکن مادہ بھی پہلے سے موجود تھا۔چنانچہ ان کے ہاں مادہ بھی قدیم ہے اور خدا بھی۔گویا اب یہ ثنویت ہوگئی کہ خدا اور مادہ (matter) دونوں قدیم ہیں۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کا ایک اور سکول آف تھاٹ ہے جو تین کو قدیم مانتا ہے' یعنی خدا بھی قدیم' مادہ بھی قدیم اور روح بھی قدیم۔ظاہر بات ہے کہ یہ تو بدترین شرک ہے' ہم اس کے بارے میں مزید گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔یہ ''تعددِ قدماء'' کے تصورات کہلاتے ہیں۔

خالق اور مخلوق کے مابین ربط و تعلق کی ایک دوسری شکل بعض لوگوں نے یہ تجویز کی ہے کہ درحقیقت خدا ہی نے اس کائنات کا روپ دھار لیا ہے' جیسے برف پگھل جائے تو پانی بن جاتا ہے۔اب آپ کہیں کہ پانی کہاں سے آیا اور برف کہاں گئی؟ تو دراصل برف ہی پانی ہے اور پانی ہی برف ہے۔چنانچہ اس نظریئے کی رو سے یہ کائنات ہی خدا ہے۔جب خدا ہی نے یہ شکل اختیار کر لی ہے تو گویا ہر شے خدا ہے اور ہر شے الوہیت کی حامل ہے۔اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا؟ یہ ہمہ اوست یا Pantheism کا نظریہ ہے۔

اب اس سے بھی آگے نکل آیئے۔اگر یہ کہا جائے کہ خالق و مخلوق کے درمیان ساری نسبتیں جو ہماری عقل میں آ رہی ہیں یہ قابل قبول نہیں ہیں تو پھر ایک ہی وجود ماننا

پڑتا ہے جو خالق کا وجود ہے۔ اس نظریہ کو ''توحید وجودی'' کہا جاتا ہے۔ اس کی بہترین تعبیر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''الدّین القیّم'' میں کی ہے' جو اس آیۂ مبارکہ کی بہترین تعبیر ہے' کہ خالق اور مخلوق میں نسبت کو یوں سمجھو کہ کسی شے کا تصور اپنے ذہن میں قائم کرو۔ فرض کریں آپ نے تاج محل دیکھا ہے' اب آپ تاج محل کا تصور اپنے ذہن میں لائیے۔ آپ کے ذہن میں یہ تصور آپ کی توجہ سے قائم ہے۔ جب تک آپ کی توجہ مرکوز رہے گی یہ تصور ذہن میں رہے گا' جیسے ہی توجہ ہٹے گی اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا' وہ ختم ہو جائے گا۔ اور یہ جو آپ کی ذہنی تخلیق ہے' آپ ہی اس کے نیچے بھی ہیں' اوپر بھی' اوّل بھی اور آخر بھی۔ اس کا اپنا تو کوئی وجود ہے ہی نہیں' وجود تو درحقیقت آپ کا ہے' یہ آپ کا ایک تصور ہے جو آپ نے اپنے ذہن کے اندر تخلیق کیا ہے۔ بالکل یہی تعلق ہے اس کائنات اور خالق کا۔ یہ کائنات کوئی علیحدہ شے نہیں ہے۔ گویا اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔

اب اسی ''توحید وجودی'' کی ایک تعبیر شیخ احمد سرہندیؒ نے کی ہے۔ انہوں نے ایک بڑی پیاری مثال سے واضح کیا ہے کہ یہ کائنات ہمیں نظر تو آ رہی ہے لیکن حقیقت میں اس کا وجود نہیں ہے' وجود ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا وجود ہے۔ انہوں نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ آپ ایک لکڑی لے کر اگر اس کے ایک سرے پر کوئی کپڑا باندھ دیں اور مٹی کا تیل ڈال کر دیا سلائی سے آگ لگا دیں تو اب ایک مشعل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے ایک دائرے میں تیزی سے حرکت دیجئے تو دیکھنے والے کو ایک آتشیں دائرہ نظر آئے گا' جب کہ دائرے کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے ع

ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!

وجود تو صرف اس ایک شعلہ جوالہ کا ہے' باقی حرکت کی وجہ سے بہت کچھ نظر آ رہا ہے جو فی الواقع موجود نہیں ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ ؎

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَالٌ
اَوْ عُكُوسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَالٌ

© rasailojaraid

یعنی ''اس کائنات میں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ حقیقی نہیں ہے۔ اس کی حقیقت تو بس اتنی ہے جیسے سائے ہوتے ہیں یا جیسے آئینہ میں عکس ہوتا ہے''۔

وجود تو اُس شے کا ہے جس کا عکس ہے' خود عکس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے۔ یہ نظریہ وحدت الشہود ہے۔ اس میں یہ بات ماننی پڑے گی کہ یہ کائنات جو نظر آ رہی ہے حقیقی وجود کی حامل نہیں ہے۔ بقول غالب ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے!

تو یہ کائنات در حقیقت اللہ کا تصور ہے' جو بڑا ٹھوس تصور ہے' جبکہ ہمارا تصور تو ایک ہوائی سا تصور ہوتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے مابین نسبت کی یہ بہترین تعبیر ہو گی۔

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾

اس کائنات کا اوّل بھی' آخر بھی' ظاہر بھی' باطن بھی وہی ہے۔

توحید وجودی کی ایک دوسری تعبیر بھی ہے' جو ابن عربی کی ہے۔ اور یہ بہت زیادہ دقیق تعبیر ہے' اس لئے کہ patheism اور ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود میں بہت باریک فرق ہے' جسے عام انسان کے لئے ملحوظ رکھنا آسان نہیں ہے۔ ابن عربی کا نظریہ یہ ہے کہ خالق اور کائنات کا وجود تو ایک ہی ہے' ماہیت کے اعتبار سے کائنات عین وجود ہے' لیکن جہاں تعین ہو جاتا ہے وہاں وہ غیر ہے۔ جیسے سائنس آج ہمیں بتاتی ہے کہ تمام اجسام atoms کے بنے ہوئے ہیں۔ atoms سے مالیکیول بنے ہیں اور ان سے مختلف چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ ایٹم کی مزید تقسیم کریں تو electrons اور protons ہیں' پھر اس سے بھی چھوٹے photons ہیں۔ اور حقیقت میں تو کچھ ہے ہی نہیں' صرف electric currents ہیں۔ انہی electric currents نے جو خاص شکل اختیار کی تو وہ شے وجود میں آ گئی۔ آپ کو یہ ہال خالی نظر آ رہا ہے مگر یہ خالی تو نہیں ہے' اس میں ہوا ہے' جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کا ملغوبہ ہے اور اس کے اندر وہ سارے ایٹم لطیف صورت میں موجود ہیں۔ مختلف اشیاء میں مختلف

om

formations میں ایٹم موجود ہیں۔ چنانچہ ماہیت کے اعتبار سے اس گھڑی اور عینک میں کوئی فرق نہیں' یہ انہی ایٹموں کی مختلف تراکیب ہیں۔ لیکن جب ایک خاص فارمولے کے تحت conglomeration of atoms نے یہ شکل اختیار کی تو یہ ایک دوسرے کا غیر ہیں۔ لہٰذا جہاں کسی وجود یا کسی ہستی کا تعین آ گیا وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا غیر ہے' اس کا جزو نہیں ہے' لیکن ماہیت وجود مشترک ہے۔ کل کائنات کے اندر وجود ایک ہی ہے اور وہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے۔ اس کو کہا گیا ہے ''وحدت الوجود'' یعنی وجود کا ایک ہونا۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ گیارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم ہیں جبکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم ہیں' ان کے مابین قریباً سو سال کا فرق ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس ضمن میں جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندیؒ کے نظریۂ وحدت الشہود کے مابین صرف تعبیر کا فرق ہے' حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اور اسے خود شاہ صاحبؒ نے ''توحید وجودی'' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وجود حقیقی ایک ہی ہے اور وہ اللہ کا ہے' لیکن جہاں کسی شے کا علیحدہ تشخص ہو گیا وہ اللہ کا غیر ہے' وہ خدا نہیں ہے۔ تاہم ماہیت وجود خالق اور مخلوق کے درمیان ایک مشترک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا نظریہ جسے شاہ ولی اللہؒ نے ''توحید وجودی'' سے تعبیر کیا اور اسی کی تعبیر ''**لا معبودَ الاَّ اللّٰہ**'' اور بلند تر سطح پر ''**لا مقصودَ اِلاَّ اللّٰہ' لا مطلوبَ اِلاَّ اللّٰہ'** اور **لا محبوبَ اِلاَّ اللّٰہ**'' ہے۔ مزید اوپر جا کر اسی کی تعبیر ''**لا موجودَ اِلاَّ اللّٰہ**'' سے کی جاتی ہے۔ یعنی اللہ کے سوا وجودِ حقیقی اور کسی کا نہیں' وجود حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ البتہ جیسے سمندر کے اوپر بننے والی لہریں اگرچہ الگ نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت وہ سمندر ہی کا حصہ ہیں' اسی طرح وجود بسیط خالق اور مخلوق کے درمیان مشترک ہے' البتہ جب کوئی وجود معین ہو کر کوئی شکل اختیار کر لیتا ہے تو وہ خالق کا غیر ہوتا ہے۔ یہاں یہ شے ہمہ اوست اور pantheism سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھیے' اس کے

© rasailojaraid

بعد جی میں آئے تو آپ اس نظریے کو اٹھا کر پھینک دیں' آپ کو وہ نا قابل قبول نظر آئے تو بالکل ٹھکرا دیں۔ ہمیں بڑے سے بڑے شخص سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اختلاف نہیں کر سکتے تو محمد رسول اللہ ﷺ سے نہیں کر سکتے' باقی ہر شخص سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ جن لوگوں نے اس کو مانا ہے ان کی توہین نہ ہو' ان کے بارے میں یہ سوئے ظن نہ ہو کہ (معاذ اللہ) وہ ہمہ اوست اور pantheism کے قائل ہیں اور وہ مشرک ہو گئے' گمراہ ہو گئے۔

فلسفۂ وجود کے یہ جو دو shades ہیں جن میں وحدت کا معاملہ ہے' ان کے ضمن میں ہندوستان کے مکاتب فلسفہ میں شنکر اچاریہ وحدت الوجود کا قائل تھا اور ایک فلسفی راما نجُہ وحدت الشہود کا قائل تھا۔ فلسفۂ وجود کی یہی دو interpertations ہو سکتی ہیں' حقیقت میں بات ایک ہی ہے کہ وجود صرف اللہ کا ہے' باقی کوئی شے وجودِ حقیقی کی حامل نہیں۔ یا یہ کہیے کہ ماہیت وجود کے اعتبار سے مخلوق کو خالق کے ساتھ قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے' لیکن تعین کے اعتبار سے وہ خدا کا غیر ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

بانی تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** مدظلہ کی تالیف

ایجاد و ابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک

تنزل اور ارتقاء کے مراحل

☆ قیمت: ۲۴ روپے ☆ عمدہ طباعت ☆ صفحات ۶۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 5869501-03